OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

Al-Qamar, Volume 4, Issue 1 (January-March 2021)

مابعد الطبیعاتی مسائل سے متعلق متجددانہ رجحانات کے نقد و تجزیے کا تحلیلی مطالعہ

An Analytical Study of the Critique and Analysis of Modern Trends regarding Metaphysical Issues

Muhammad Shahbaz

Doctoral Candidate Islamic Studies, University of Sargodha, Sargodha

Dr. Hafiz Muhammad Khan

Associate Professor of Islamic Studies, Moh-ud-Din Islamic University Nerian Sharif, AJ&K

Dr. Muhammad Sarwar

Assistant Professor, University of Veterinary and Animal Sciences Lahore

Abstract

There are various modern trend in the subcontinent regarding Metaphysical issues. This article presents a study of the thoughts of the scholars on various metaphysical issues and sees how the critics of modern trends are approaching them. Whether they stay close to the real Islamic point of view in criticizing modernists or not. This analysis shows that the ideology of the modernists on the subject under consideration is not correct and what the critics have criticized on them is accurate.

Keywords: Modern trends, subcontinent, Metaphysical issues, Criticism

تمہید

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ملکیت عطا کرنے کے ساتھ بندے کو سرمایہ داری نظام کی طرح ایسا خود مختار نہیں بنایا کہ وہ جیسے چاہے کرتا پھرے، بلکہ حدود کے تعین کے لیے سود، قمار، سٹہ اور اکتناز ان کے اسباب و عوامل کو حرام قرار دیا اور اعلان کر دیا: ”اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرتہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں، سو ان سے بالکل

CC BY

الگ رہو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو۔“ پھر حصول رزق کے تمام جائز طریقوں کی اجازت دے کر نقصان دہ عوامل کی نشاندہی فرما کر ان سے منع بھی کر دیا۔ قرآن میں ہے: ”اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔“ دوسری طرف رسول اللہؐ کی زبانی یہ اعلان کر دیا: ”بیع جلب“ اور ”بیع حاضر لباد“ منع ہے۔ مزید یہ کہ معیشت کی حدود کو متعین کرنے کے ساتھ ساتھ غریبوں تک دولت پہنچانے کے لیے سرمایہ داروں پر زکوۃ جیسے بہت سے اخراجات اسلام نے واجب کر دیئے، جنہیں صرف احسان کے طور پر نہیں، بلکہ حق کے طور پر واجب قرار دیا۔ نیز زکوۃ کے علاوہ عشر، خراج، صدقات، کفارات، نفقات، وصیت اور میراث کے ذریعے مالداروں کے تالاب سے غریبوں کے کھیتوں کی طرف مختلف نہریں جاری کر دیں تاکہ پورا معاشرہ سرسبز و شاداب رہے اور آیت قرآنی "وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللہِ[1]" اور "کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ[2]" کے ذریعے حلال آمدنی کے حصول پر توجہ دلاتے ہوئے اس کو غریبوں پر خرچ کرنے کی تاکید بھی کر دی، چنانچہ قرآن و حدیث کی تعلیمات انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب سے بھری پڑی ہیں۔ غرض اسلام نے ایک طرف سرمایہ داری کی ناجائز آمدنی اور اشتراکیت کے ظلم و جور کو ختم کر کے انسان کو حق ملکیت دیا اور دوسری طرف اس کے اخرجات میں اضافہ کر کے دولت کے بہاؤ کا رخ عام معاشرے کی طرف پھیر دیا تاکہ خوشحالی ہی خوشحالی نظر آئے، معاشرے سے غربت دور ہو، انسان چین و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ نہ امیر غریبوں کا خون چوستے پھریں اور نہ ہی غرباء بقاء حیات اور زندگی کے سانس پورے کرنے کے لئے ایک ایک لقمہ کو ترسیں۔ ذیل میں ہم قرآن و سنت کے مقابل متجددانہ رجحانات کے حاملین کا موقف اور اس کا نقد پیش کر کے مسئلہ کی وضاحت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

متجددانہ رجحانات کے حاملین کے نزدیک انسان کا کمایا ہوا مال اس کا ذاتی حق ہے وہ جہاں چاہے خرچ کر سکتا ہے جبکہ دین اسلام نے انسان کے کمائے ہوئے مال کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی، بلکہ اس کے لئے حدود و قیود تعین کی ہیں، جن سے وہ کسی صورت انحراف نہیں کر سکتا۔

ملکیت مال کے بارے میں متجددانہ رجحانات اور اس کا نقد

ملکیت مال کے بارے میں اسلام کے صریح حکم کے باوجود بعض متجددانہ رجحانات کے حاملین اس کو کو اسلام کے منافی قرار دیتے ہیں اور قرآن و سنت میں استعمال ہونے والے لفظ انفاق کے معانی اور توضیح عام محدثین سے ہٹ کر دیگر مختلف معانی کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ یہ وہ معانی و مفاہیم ہیں جو علما محققین میں سے کسی نے بیان نہیں کئے۔ متجددانہ رجحانات کے حاملین کے موقف کے مطابق وہ انفاق کی لغوی بحث کی ابتدا، نفق بمعنی سرنگ سے کرتے ہیں حالانکہ اس مادہ سے کوئی واحد اور تنہا اصل نہیں ہے، نفق بمعنی قلیل و کم ہونا اور فنا و نفاذ کا شکار ہونا ہے۔ اور نفق بمعنی سرنگ متجددانہ رجحانات کے حاملین میں سے بعض لوگ یا تو اپنی جہالت یا شرارت سے، اصل اول کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہیں اور نفق بمعنی سرنگ لے کر تمام علماً لغت کے خلاف، لفظ "انفاق" میں کھلا رکھنے کا مفہوم داخل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علما محققین نے متجددانہ رجحانات کے حاملین کے موقف پر نقد کر کے دلائل کے ساتھ یہ بات پیش کی ہے کہ ملکیت مال کی اسلام میں نفی ہر گز نہیں کی گئی ہے۔

ناقدین علما محققین کا موقف یہ ہے کہ یہ لفظ نفق بمعنی سرنگ سے ماخوذ ہونے کی بجائے، نفق بمعنی نقصان وریعہ سے ہو نفاد سے ماخوذ ہے۔ خواہ یہ قلت یا کمی اور فنا و نفاذ۔ بذل و صرف کے ذریعہ سے ہو یا خرید و فروخت کے عمل سے، یا موت و ہلاکت اسکا سبب ہو، چناچہ اسی نفق (بمعنی نقصان و نفاد) سے باب افعال کا مصدر "انفاق" لایا گیا ہے جس کا مفعول اگر مال و دولت ہو تو دنیا کی ہر لغت میں اس کا معنی بذل و صرف ہی دیا گیا ہے، کیونکہ اس معنی میں نقصان و نفاد کے دونوں مفہوم پائے جاتے

ہیں۔ کسی لغت کی کتاب میں انفق المال کا معنی اس نے مال کو کھلا رکھا موجود نہیں ہیں، حاملین تجدد اپنی انتہائی کوشش کے باوجود کسی گری پڑی کتاب لغات سے بھی یہ معنی بیان نہیں کر پائے۔ انہوں نے لفظی شعبدہ بازی حرفی بازیگری کے نتیجہ میں خود پیدا کئے ہیں۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ انفاق کے معنی خرچ کرنے کے علاوہ کھلا رکھنے کے بھی ہیں، بلکہ وہ بڑی بلند آہنگی اور بڑے دھڑلے سے بذل وصرف کے معانی کی نفی کرتے ہیں اور یہ اصرار کئے چلے جاتے ہیں کہ "اس مادہ کے بنیادی معنی "خرچ کرنا" نہیں، بلکہ کھلا رکھنا ہے۔ لیکن میدان تحقیق میں یہ انکشاف کر ڈالنے کے بعد کہ "انفاق" کے معنی "خرچ کرنا" نہیں ہے وہ خود اپنی تحقیق کے خلاف اسی معنی کو قبول کرتے ہیں، چند مثالیں پیش خدمت ہیں جو سب کی سب مفہوم القرآن سے لی گئی ہیں۔ لغوی تحقیق کی آڑ میں متجددانہ رجحانات کے حاملین میں پرویز نے قرآنی الفاظ کے اصل مفہوم سے کس طرح پیچھا چھڑایا یہ واضح ہے، یہ سب کچھ کسی حد تک "انفاق" کی اس لغوی تحقیق کی بحث سے واضح ہے، پوری لغات القرآن، ان کی ذہنی چابکدستی اور ہاتھ کی صفائی کا کرشمہ ہے جس میں انہوں نے قرآنی مفردات کے معانی و مفاہیم میں کھینچ تان، کتربیونت اور مسخ وتحریف سے خوب کام لیا ہے۔ ہر صاحب علم جس کی نظر اگر جملہ کتب لغات عربیہ پر نہیں تو کم از کم ان سب کتب لغات پر ضرور وسیع ہے جن کو سامنے رکھ کر پرویز صاحب نے اپنی لغات القرآن کو مرتب اور مدون کرنے کا دعوی کیا ہے موصوف نے اصل معانی ومفاہیم سے کہاں کس طرح اور کن ذہنی تحفظات کے تحت انحراف کیا ہے قرآن کریم کے عربی الفاظ میں تہذیب فرنگ کے مفہوم کو بالعموم اور اشتراکیت کے نظام کو بالخصوص داخل کرتے ہوئے نئی نرالی لغت مرتب کرنا۔ ایک ایسی گھناونی سازش ہے بھلا جس کے سامنے وہ دسائس کسی شمار و قطار میں نہیں۔ جنہیں غلام احمد پرویز عجمی سازشوں کا نام دے کر زندگی بھر علمائے سلف کو بالعموم اور محدثین کو بالخصوص برابھلا کہتے رہے ہیں۔ جہاں تک مال ودولت کی ملکیت کا تعلق ہے قرآن کی بیسیوں آیات اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ مثلا "وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ۔۔۔ عَلِيمًا"[3] اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں دیا ہے اسکی تمنانہ کرو جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق انکا حصہ ہے ہاں اللہ تعالی سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے "اس آیت کا مفہوم خود پرویز صاحب نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے ایک دوسرے کی حفاظت کے سلسلے میں اس تصور کا ازالہ بھی ضروری ہے جس کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حقوق ملکیت صرف مرد کو حاصل ہے، عورت کو نہیں ہوتے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ عورت اپنے جائیداد ومال کی آپ مالک ہوتی ہے اس طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کمائی کرنا صرف مرد کا کام ہے، عورت ایسا نہیں کر سکتی ایک دوسرے مقام پر پرویز صاحب رقمطراز ہیں "مردوں اور عورتوں کے جداگانہ حقوق ملکیت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرنے والے کے ترکہ میں ان سب کا حصہ ہو صرف مردوں ہی کا نہ ہو، الغرض آیت "وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ۔۔۔ عَلِيمًا" اور مت ہوس کرو! اس فضیلت میں جو اللہ نے بعض کو بعض پر دی ہے، مردوں کے لئے اپنی کمائی سے حصہ ہے، اور عورتوں کے لئے اپنی کمائی سے حصہ ہے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو، بے شک اللہ کو ہر چیز کا علم ہے "۔ خود پرویز صاحب کے اپنے بیان کردہ مفہوم کی روشنی میں ذاتی ملکیت مال ودولت پر قاطع برہان ہے اس کے علاوہ بھی متعدد آیات میں مال ودولت اور زمین کی انفرادی ملکیت کو اسلامی معاشرے کی اساسی پالیسی کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ منع بخل کا حکم ذاتی ملکیت پر دال ہے۔ قرآن کریم نے بہت سی آیات میں انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ ساتھ بخل اور کنجوسی سے بھی منع کیا

ہے، اور مختلف اسالیب سے اہل ایمان کو اس قبیح عادت بچنے کا حکم دیا ہے، مثلاً "ٱلَّذِينَ يَبۡخَلُونَ وَيَأۡمُرُونَ ٱلنَّاسَ بِٱلۡبُخۡلِ "[4] اور اسی طرح عہد نبوی میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

عہد نبوی میں دولت زر کی شخصی ملکیت

غزوہ تبوک (جو رجب 9ھ میں وقوع پذیر ہوا) میں لوگوں نے جس ایثار و قربانی سے اپنے اموال پیش کئے اور اس اسلامی تحریک کی مدد و معاونت کی۔ اس کی تفصیل پرویز صاحب نے یوں بیان کی ہے۔ "یہ معرکہ اخلاص و منافقت کی امتحان گاہ تھا، چناچہ ایک طرف صحابہ کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ بھی کسی کے پاس تھا لے کر حاضر ہو گیا۔ حضرت عثمان نے (۹۰۰) اونٹ، ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کئے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف نے چالیس ہزار درہم پیش کئے۔ حضرت عمر کئی ہزار روپے کا نقد و جنس لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیق اپنے گھر اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے سوا کچھ بھی نہ چھوڑ کر آئے۔ حضرت ابو عقیل انصاری نے دو سیر چھوارے لا کر حاضر کئے اور عرض کی کہ رات بھر کسی کے کھیت پر مزدوری کر کے چار سیر چھوہارے حاصل کئے تھے دو سیر بچوں کو دے آیا ہوں اور دو سیر آپ کی خدمت حاضر ہیں۔[5]

عہد بنوی و دور صدیقی میں تقسیم غنائم

اموال غنیمت میں سے چار اخماس کا مجاہدین میں تقسیم کیا جانا بھی مال و دولت کی انفرادی ملکیت کا قطعی اور واضح ثبوت ہے۔ غنائم کی تقسیم اگرچہ ہر دور میں ہوتی رہی۔ مگر عہد نبوی اور دور صدیقی میں تقسیم غنائم کا ذکر خود پرویز صاحب نے بھی کیا ہے۔ رسول اللہ اور خلافت صدیقی میں یہ قانون تھا کہ مال غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ حضرت خالد بن ولید کی معزولی پر بحث کرتے ہوئے بعض متجددانہ رجحانات کے حاملین کے نزدیک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں مدینہ بلا لیا اور ان سے کہا "تم کہاں کے ایسے دولت مند تھے کہ اس قدر خطیر رقم انعام میں دے دی" انہوں نے کہا: ان فتوحات میں ساٹھ ہزار درہم بطور مال غنیمت میرے حصے میں آیا ہے۔ آپ حساب کر لیجئے! جس قدر اس سے زائد ہو وہ لے لیجئے۔ چناچہ حساب کیا گیا تو اسی ہزار درہم نکلے۔ ان میں سے ساٹھ ہزار درہم چھوڑ دیے گئے اور باقی بیس ہزار بیت المال میں جمع کرا دیے گئے۔[6]

عہد فاروقی اور مال دولت کی شخصی ملکیت

عہد فاروقی کے بے شمار واقعات میں سے درج ذیل واقعہ بھی مال و دولت کی شخصی ملکیت کا آئینہ دار ہے یہ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ نے دیکھا کہ لوگ اپنی بیویوں کا مہر قرر کرنے میں بڑی افراط سے کام لے رہے ہیں، تو آپ نے ایک اجتماع میں اس کا ذکر کیا اور چاہا کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار مقرر کر دی جائے۔ اس پر ایک کونے سے ایک عورت آواز آئی کہ کیا یہ بات اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔ "وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ۔۔۔ وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا "[7] اور اگر تم ایک عورت کو دوسری عورت سے بدلنا چاہو، اور ایک کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لو گے۔ " اور تم نے بیویوں میں سے کسی کو ڈھیروں مال بھی دے رکھا ہو تو اس سے کچھ واپس نہ لو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر بول اٹھے کہ عورت نے سچ کہا ہے اور عمر غلطی پر تھا شادی کے موقع پر لوگوں کا اپنی مالی حیثیت کے مطابق حقیر یا خطیر رقم کو بصورت حق مہر بیویوں کو دینے کا رواج صریحا اس معاشرت سے میل کھاتا ہے جس میں نہ صرف یہ کہ ذاتی ملکیت مال کا اصول متداول ہو۔ بلکہ لوگوں میں مساوات شکم کی بجائے تفاضل فی الرزق بھی پایا جاتا ہو۔ خلافت فاروقی کا یہ واقعہ اس امر کو مبرہن کر ڈالتا ہے کہ اس دور میں بھی مال وزر کی انفرادی ملکیت کا اصول کار فرما تھا۔ اگر فاروقی حکومت لوگوں کی مکسوبہ دولت میں

فاضلہ دولت خود اپنی تحویل میں لے لیتی تھی تو قنطار ڈھیر مال دینے کا سرے سے امکان ہی نہ ہوتا، اگر ریاست واقعی لوگوں کا زائد مال لے لیا کرتی تو حق مہر کے قطعی تعین کی کوئی گنجائش ہی نہ رہتی کجا یہ کہ لوگ افراط سے کام لیتے اور پھر خلیفہ وقت کو کم از کم یا زیادہ سے زیادہ کوئی حد مقرر کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی، اور خلیفہ عمر سے مخاطب خاتون اس دروازے کو کھلا رکھنے پر زور دیتی، جس سے خواتین کے حصول قنطار کا امکان وابستہ رہتا تھا۔ یہ سب کچھ تو اس نظام حکومت اور معاشرے ہی میں ممکن ہے جہاں شخصی ملکیت مال کا اصول جاری ہو۔ اور لاریب خلافت فاروقی ایسے ہی نظام حکومت اور سماج کا منظر پیش کرتی ہے نہ کہ وہ جو مفکر قرآن کی خلاقی ذہن کی کرشمہ سازی ہے۔

ملکیت مال کی بحث کا تجزیہ

قرآن حکیم نے جگہ جگہ اہل ایمان کو انفاق اموال کا حکم دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ حکم ذاتی ملکیت کو شامل ہے، جبکہ پرویز صاحب نے اس لفظ سے اس لزوم و تضمن کو خارج کرنے کے لئے اس مفہوم کو مکمل پر تبدیل کر دیا ہے، چنانچہ "وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ [8]" کے تحت لکھا ہے۔ ان الفاظ کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "جو روزی ہم نے دی ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ تو یقیناً ہر شخص اپنے ہی مال میں سے خرچ کرتا ہے، تو پھر یہاں خرچ کرنے والوں کو متقین کہنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ کہ متقین وہ ہیں جو اپنے مال و دولت کو خرچ کرتے ہیں۔ اس کے لئے زیاسے زیادہ یہ کہہ دینا کافی تھا کہ وہ اپنے روپے پیسے کو احتیاط سے خرچ کرتے ہیں اور فضول خرچی (اسراف و تبذیر) سے بچتے ہیں۔ پرویز کا ان الفاظ کے ترجمہ پر اعتراض کرنا کہ جب آدمی اپنی دولت کو خرچ کرتا ہے تو اسے متقین کی صفات میں کیوں شامل کیا گیا ہے، نہایت سطحی اعتراض ہے جو ان کی کوتاہ نظری پر دال ہے، اگر وہ غور کرتے تو انہیں یہ محسوس ہوتا کہ بخیل اور کنجوس لوگوں کے مقابلے میں واقعی یہ اہل تقوی کی خوبی ہے کہ وہ اپنی دولت پر سانپ بن کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ اسے خرچ کرتے ہیں، علاوہ ازیں ان الفاظ میں دو مفہوم اور بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ "ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے" خرچ کرتے ہیں۔ اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے یہ لوگ ناجائز ذرائع آمدنی اختیار نہیں کرتے، بلکہ ہمارے عطاء کردہ رزق حلال پر قناعت کرتے ہیں اور اسی روزی پر گزارہ کرتے ہیں جو انہیں حلال ذرائع سے پہنچتی ہے۔ اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے حرام مال پر ہاتھ مارنا ان کا شیوہ نہیں ہے۔ یہ متقی لوگ ہیں ان کے اموال کے مصرف فسق و فجور اور برے کاموں پر نہیں بلکہ دین اسلام کی عظمت رفتہ اور بر و تقوی کے کاموں پر خرچ ہوتے ہیں یہ لوگ بخل سے دامن کش رہتے ہیں، بھلائی کے کاموں میں اپنے مال صرف کرتے ہیں، کیونکہ اسلام میں انفاق ہمیشہ فی سبیل اللہ ہی کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ یہی وہ حقائق ہیں جن کی بنا پر "وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ" کو صفات مومنین میں شمار کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا فریقین کے دلائل کی روشنی میں اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ پرویز صاحب کا موقف ذاتی ملکیت مال کے حوالے سے انتہائی کمزور مبنی بر عقل ہے۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں قرآن و سنت سے نہایت قوی دلائل موجود ہیں جو پرویز صاحب کے موقف کی حیثیت ختم کر دیتے ہیں۔

اسلام میں سرمایہ داری کی حیثیت پر متجددانہ رجحانات اور اس کا نقد

سرمایہ دارانہ نظام ایک معاشی و معاشرتی نظام ہے جس میں سرمایہ بطور عاملِ پیدائش نجی شعبہ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں کرنسی چھاپنے کا اختیار حکومت کی بجائے کسی پرائیوٹ بینک کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اشتراکی نظام کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں نجی شعبہ کی ترقی معکوس نہیں ہوتی بلکہ سرمایہ داروں کی ملکیت میں سرمایہ کا ارتکاز ہوتا ہے اور امیر امیر تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس میں منڈی آزاد ہوتی ہے اس لیے اسے آزاد منڈی کا نظام بھی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ آج کل کہیں بھی منڈی مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتی مگر نظریاتی طور پر ایک سرمایہ دارانہ نظام میں منڈی مکمل طور پر آزاد ہوگی۔ جملہ حقوق، منافع خوری اور نجی ملکیت اس نظام کی وہ خصوصیات ہیں جس سے سرمایہ دارانہ نظام کے مخالفین کے مطابق غریبوں کا خون چوسا جاتا ہے۔ جدید دانشوروں کے مطابق آج سرمایہ دارانہ نظام اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے اور ایک متبادل نظام کی آوازیں شدت سے اٹھنا شروع ہو گئیں ہیں۔ مختصراً سرمایہ دارانہ نظام یہ کہتا ہے کہ ذاتی منافع کے لیے اور ذاتی دولت و جائیداد اور پیداواری وسائل رکھنے میں ہر شخص مکمل طور پر آزاد ہے، حکومت کی طرف سے اس پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ تاہم دنیا میں سو فیصد (100٪) سرمایہ دارانہ نظام کسی بھی جگہ ممکن نہیں، کیونکہ حکومت کو کسی نہ کسی طرح لوگوں کے کاروبار میں مداخلت کرنی پڑتی ہے۔ امریکا، برطانیہ، فرانس، اٹلی وغیرہ میں سرمایہ دارانہ نظام ہیں۔ جب کہ قرآن مجید سرمایہ داری کے اصول وضوابط بیان کرتے ہوئے اس مسئلہ کی حیثیت کو بھی واضح کرتا ہے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مال خرچ کرنے کی تلقین کی ہے، بلکہ مال خرچ نہ کرنے والوں کے لئے سخت ترین وعید بھی بیان فرمائی ہے کہ جو لوگ سونا چاندی اور زیورات کو جمع کرتے ہیں اور اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کے لئے سخت عذاب کی وعید سنائی ہے اور اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق کا دادی کا حصہ سدس دلوانا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قرآن کے بعد جس چیز پر اپنے فیصلوں کی بنیاد رکھتے تھے وہ سنت رسول تھی، بلکہ سنت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی تھی صحابہ کرام میں بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے حضرت عثمان غنی کے پاس بے شمار دولت تھی، حضرت عبد الرحمان ابن عوف کے کاروبار کا یہ عالم تھا کہ انکے مال تجارت کا اگلا اونٹ مدینہ میں ہوتا تھا اور پچھلا مصر میں، اسی قسم کی روایات اور تاریخ پر متفرع فقہ کے وہ احکام مستنبط ہوئے جنکی رو سے مال و دولت اور جائیداد و زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی کی ہی نہیں جا سکتی۔ ایسی اور بھی بے شمار مثالیں موجود ہیں جب کہ بعض متجددانہ رجحانات کے حاملین سرمایہ داری کو سراسر غیر اسلامی قرار دیتے ہیں ان کے مطابق ہے سرمایہ داری کے حوالے سے تمام روایات عہد عباسی میں وضع کی گئی ہیں۔ جب سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام مملکت پر مسلط ہو چکا تھا اسے اسلامی قرار دینے کے لئے یہ روایات وضع کی گئی۔ جن میں کچھ کتب حدیث میں جمع ہو گئیں اور کچھ کتب تاریخ میں انہیں روایات پر مبنی فقہ مرتب کی گئی۔ لہٰذا نظام سرمایہ داری حدیث اور فقہ دونوں کی رو سے عین اسلامی بنا دیا گیا۔ متجددانہ رجحانات کے حاملین کا یہ موقف چونکہ قرآن و سنت کی واضح تعلیمات کے خلاف تھا، اس لئے علما محققین نے اس پر نقد کے دلائل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ متجددانہ رجحانات کے حاملین کے مطابق علما کرام جس چیز کو سند اور حجت قرار دیتے ہیں وہ نفس حدیث و سنت ہے نہ کہ کتب روایات ہیں جیسا کہ بعض متجددانہ رجحانات کے حاملین کے مطابق روایات عہد عباسی میں وضع اور مرتب ہوئی تھیں لیکن نفس حدیث و سنت کو، سند و حجت مانتے ہوئے ان کا اتباع عہد نبوی اور خلافت راشدہ اور ادوار مابعد بھی ہوتا رہا، قطع نظر اس کے کہ جس حدیث و سنت کی پیروی کی جارہی تھی، وہ قرآن کے مجمل حکم کی تفصیل و تشریح کرتی ہے یا قرآن سے زائد کوئی ایسا حکم

دیتی ہے جس پر قرآن خاموش ہے۔ صحابہ کرام کے فرداً فرداً اتباع حدیث و سنن کو بیان کرنے کی بجائے، چند اصحاب رسول کے اتباع سنن واحادیث پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس سے قبل چاروں خلفائے راشدین کا عمل آپ کے سامنے ہے جو مذکور ہو چکا ہے، صحابہ کرام میں سے بلند پایہ شخصیت، حضرت ابو بکر صدیق ہیں۔ اتباع سنت اور تمسک بالسنۃ کی بابت ان کے چند واقعات ملاحظہ فرمائیں "حضرت ابو بکر صدیق کے پاس ایک عورت آئی جو اپنے پوتے کے ترکہ میں سے حصہ مانگتی تھی۔ انہوں نے فرمایا:" کہ میں کتاب اللہ میں تیرا حصہ نہیں پاتا، حضرت مغیرۃ بن شعبہ نے کہا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے دادی کو سدس دلوایا ہے، فرمایا: کوئی تمہارے اس قول پر شاہد ہے۔ محمد بن مسلمہ نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں، اسی وقت اس کو سدس دلوایا۔[9] غور فرمایئے: میراث جدہ میں خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جناب حضور ﷺ کے ایک ایسے " فیصلہ کی اتباع کر رہے تھے، جو بقول ان کے قرآن میں موجود نہیں ہے بلکہ زائد از قرآن ہے۔ لیکن منکرین حدیث ایسے زائد از قرآن فیصلوں کو خلاف قرآن کہہ کر حدیث و سنت کو در کر دیتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق ایسے امور و معاملات میں بھی قضایا رسول اللہ کے پابند تھے جو دینی لحاظ سے شاید آخری درجے کے مسائل ہوں۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ امیر عساکر زید ہو یا بکر۔ اہمیت وفضیلت تو نفس جہاد کی ہے نہ کہ اس امر کی کہ سالار فوج کون ہے؟ لیکن فیصلہ چونکہ اس رسول کا تھا جس کی اطاعت عین اطاعت خداوندی تھی اور جس کی زندگی اہل ایمان کے لئے اسوہ حسنہ تھی اس لئے خلیفہ اول نے قضیہ رسول پر عمل پیرا ہونا اور عمل درآمد کروانا ضروری سمجھا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی شرح صدر پا گئے۔ جو اس معاملہ میں اختلاف کر رہے تھے۔ حضرت اسامہ زید بن حارثہ کے بیٹے تھے جو آپ ﷺ کے مشہور غلام تھے۔ علاوہ بریں نوعمر جوان تھے اس وقت عمر سترہ سال تھی۔ انصار کی طرف سے حضرت عمر نے حضرت ابو بکر سے کہا: اگر آپ لشکر بھیجتے ہی ہیں تو کسی شریف النسل اور سن رسیدہ شخص کو اس کا امیر مقرر فرما دیں۔ یہ سن کر حضرت ابو بکر غصہ سے بے تاب ہو گئے اور حضرت عمر کی داڑھی پکڑ کر کہا کہ رسول اللہ نے اسامہ کو سردار مقرر کیا ہے میں ان کو برطرف کر دوں۔ حضرت عمر قرآن کے بعد جس چیز پر اپنے فیصلوں کی بنیاد رکھتے تھے وہ سنت رسول اور سنت ابو بکر بھی تھی۔ ان کے بعد حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو کچھ لوگ ان سے ناراض تھے اور کچھ لوگ راضی۔ لیکن جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو جو پہلے ان سے ناراض تھے وہ بھی ان سے راضی تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر کے نقش قدم پر معاملات کو سنوارا۔ وہ ان دونوں کا اس طرح اتباع کرتے تھے جیسے بچہ اپنی ماں کا۔ کتب احادیث و تاریخ میں سے ایسے بے شمار واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ عباسی دور میں روایات کے مرتب اور مدون ہونے سے پہلے صحابہ و تابعین وغیرہم کا عمل بالحدیث تعلیم حدیث اور تعلم سنن وغیرہ کی کارگزاریاں کیا نفس حدیث و سنن کی دینی اہمیت ظاہر نہیں کرتیں۔ یہ بات بالکل بے جا اور لغو ہے کہ کتب روایات کب مرتب اور مدون ہوئیں؟۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ ان روایات کی ترتیب و تدوین سے قبل ان کی دینی حیثیت کو مان کر ان پر عمل ہو رہا تھا یا نہیں ؟۔ اور یہ بات طلوع اسلام کے لٹریچر ہی سے واضح ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین کے ہاں سنن رسول اور احادیث نبویہ ؐ بھی معمول بہا تھیں۔ جو بجائے خود ان کی دینی حیثیت پر دلالت کرتی ہیں۔ عباسی دور میں ترتیب و تدوین روایات کے عمل سے مفکر قرآن کا یہ تاثر پیدا کرنا کہ اس سے پہلے روایات حدیث و سنن کا وجود ہی نہ تھا، محض ایک شاطرانہ مغالطہ آرائی ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ جب سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام مملکت پر مسلط ہو چکا تھا، تو اسے اسلامی قرار دینے کے لئے روایات وضع کی گئیں۔ جن میں سے کچھ کتب حدیث میں جمع ہو گئیں اور کچھ کتب تاریخ میں، ان ہی روایات پر مبنی فقہ مرتب کی گئی۔ لہٰذا

سرمایہ داری نظام حدیث اور فقہ دونوں کی رو سے عین اسلام بنا دیا گیا۔ تو یہ سب کچھ پرویز صاحب نے اپنے ہی خیالات میں گھوم پھر کر فرما دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ میں کارل مارکس کی تراشی ہوئی اشتراکیت کا وہ نظام رائج تھا جسے انہوں نے نظام ربوبیت کے زیر عنوان قرآنی فکر کے نام پر درآمد کیا ہے اور پھر اس کی جگہ بعد میں سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی۔ حالانکہ نہ تو اسلام کے صدر اول میں نظام ربوبیت کا پھندا لوگوں کی گردنوں میں پڑا ہوا تھا، اور نہ ہی ایسا تھا کہ حدیث و سنت معمول بہانہ تھے۔ اسلام کے مکمل نفاذ کے اس سنہری دور میں جو معاشی نظام رائج تھا وہ نہ اشتراکی نظام تھا اور نہ ہی سرمایہ دارانہ نظام تھا۔ البتہ وہ ایک ایسا نظام تھا جس میں ذاتی اور انفرادی ملکیت کا اصول کارفرما تھا اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ آخرت میں جواب دہی جیسے عقائد کی کوکھ سے جنم لینے والا اخلاقی نظام ہی اس اقتصادی نظام کا پشت پناہ تھا۔ بعد کے ادوار میں جب کہ اخلاقی نظام کی چولیں ڈھیلی پڑ گئیں، تو پھر ہر شعبہ حیات میں بھی بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا۔ متجددانہ رجحانات کے حاملین کے مطابق قرآن مجید میں سرمایہ داری کے خلاف بے شمار آیات آئی ہیں ان میں دو تین آیات سورۃ توبہ کی ہیں جن میں یہ کہا گیا "وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ" ہے[10] جو لوگ سونا چاندی مال و دولت جمع کرتے ہیں اور اسے فی سبیل اللہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے قوانین خداوندی کے ماتحت خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسولؐ! آپ ان کے لئے خدا کی طرف سے المناک عذاب کا اعلان فرما دیں، یہ عذاب اس دن وارد ہوگا جب اس مال کو جہنم کی آگ پر تپایا جائے گا، اور اس سے ان کی پیشانی پہلو اور کمر کو داغا جائے گا۔ اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال و دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے مختص کر رکھا تھا اب تم اس کا مزہ چکھو۔ ظاہر ہے قرآن کا یہ حکم سرمایہ داری کو جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اب دیکھیے حدیث کی رو سے اس آیت کی تفسیر کیا کی گئی ہے۔ ابو داود میں ہے: حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انھوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمر نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس سیدنا عمر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ آیت آپ کے صحابہ پر گراں گزری ہے آپؐ نے فرمایا: کہ خداوند تعالیٰ نے زکوۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے، اور میراث کو اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو بھی کچھ حصہ مل جائے، سیدنا ابن عباس فرماتے ہیں: آپؐ کا یہ فرمان سن کر جناب عمر نے نہایت خوشی سے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ یعنی اس تفسیر کی رو سے جسے ارشاد رسالت مآبؐ کہہ کر پیش کیا گیا۔ قرآن کریم کی اس آیت کا مطلب یہ ہو گیا کہ اگر سال بھر کے بعد اڑھائی فیصد زکوۃ دے دی جائے۔ تو پھر جس قدر جی چاہے دولت جمع کی جاسکتی ہے۔ اس کی تائید میں تاریخ آگے بڑھی اور اس نے بتایا کہ صحابہ کرام میں بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے۔ حضرت عثمان غنی کے پاس بے شمار دولت تھی۔ حضرت عبد الرحمان ابن عوف کے کاروبار کا یہ عالم تھا کہ ان کے مال تجارت کا اگلا اونٹ مدینہ میں ہوتا تھا اور پچھلا مصر میں۔ اسی قسم کی روایات اور تاریخ پر متفرع فقہ کے وہ احکام مستنبط ہوئے جن کی رو سے مال و دولت اور جائیداد و زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی کی ہی نہیں جاسکتی۔

اسلام میں سرمایہ داری کی حیثیت پر تجزیہ

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مال خرچ کرنے کی تلقین کی ہے، بلکہ مال خرچ نہ کرنے والوں کے لئے سخت ترین وعید بھی بیان فرمائی ہے کہ جو لوگ سونا چاندی اور زیورات کو جمع کرتے ہیں اور اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کے لئے سخت عذاب کی وعید سنائی ہے اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق کا دادی کا حصہ سدس دلوانا، حضرت عمر قرآن کے بعد جس چیز پر اپنے فیصلوں کی بنیاد رکھتے تھے وہ سنت رسولؐ اور سنت ابو بکر تھی۔ ان کے بعد حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو کچھ لوگ ان سے ناراض تھے اور کچھ لوگ راضی لیکن جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو جو پہلے ان سے ناراض تھے وہ بھی ان سے راضی تھے۔ انہوں نے جناب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر کے نقش قدم پر معاملات کو سنوارا۔ حضرت عثمان غنی اور حضرت عبد الرحمن بن عوف کا مال تجارت اور غلے کے ڈھیر جمع رکھنا، اللہ کے رستے مختلف مواقع پر خرچ کرنا، کتب سیرت سے ہمیں یہاں تک ملتا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابر کا ہاتھ چوما اور فرمایا" اس ہاتھ کو آپؐ نے بوسہ اس لئے دیا ہے کہ یہ ہاتھ محنت مزدوری کرتے ہیں جس میں سے حضرت جابر اللہ کے راستے میں خرچ کرتے تھے [11]۔ غزوہ تبوک کے موقع پر حضرات صحابہ کرام کا بے دریغ مال خرچ کرنا[12]۔ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صحابہ کے پاس ضرورت سے زائد مال ہر وقت موجود رہتا تھا۔

لہذا متجددانہ رجحان کے حاملین کا یہ موقف "کہ یہ روایات عہد عباسی میں وضع اور مرتب ہوئی تھیں، جب سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام مملکت پر مسلط ہو چکا تھا، اسے اسلامی قرار دینے کے لئے روایات وضع کی گئی" بے بنیاد اور بے دلیل ہے جو مذکورہ دلائل کے مقابلے میں نظر التفات تک کے لائق نہیں۔ اور ناقدین کے دلائل نہایت قوی اور مضبوط ہیں جو متجددانہ رجحانات کے حاملین کے موقف کی حیثیت کو سرے سے ختم کر دیتے ہیں۔ اسلامی شریعت کی رو سے مال و دولت اور جائیداد و زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی نہیں جا سکتی۔

یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ پر متجددانہ رجحان اور اس کا نقد

دین اسلام نے آدمی کے فوت ہو جانے کے جن عوامل پر رہنمائی فرمائی ہے ان میں اولین چیز میت کے کفن و دفن، ادائیگی قرض اور میت کی وصیت کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آدمی کے فوت ہو جانے کے بعد دین اسلام نے اس کی وراثت کی تقسیم بھی خود طے فرما دی ہے اور کچھ صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں میت کی اپنی اولاد نہ ہونے کی صورت میں پوتا مکمل وراثت اور بعض مواقع پر نصف جبکہ بعض مواقع پر کچھ حصوں کا وارث قرار پاتا ہے جب کہ متجددانہ رجحانات کے حاملین میں سے بعض نے پوتے کو سرے سے وراثت سے محروم قرار دے کر آئمہ محدثین سے ہٹ کر ایک متجددانہ موقف اپنایا ہے۔ ان کے مطابق "لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ ٱلْوَٰلِدَانِ وَٱلْأَقْرَبُونَ اور يُوصِيكُمُ ٱللَّهُ فِىٓ أَوْلَٰدِكُمْ" [13] ان آیات میں والدان، اولاد، اور اقربون کے الفاظ تشریح طلب ہیں، ہماری زبان میں والدین سے مراد صرف ماں باپ ہوتے ہیں۔ اور اولاد سے بیٹے اور بیٹیاں۔ لیکن عربی زبان میں ماں باپ اور ان سے اوپر تک دادا اور پردادا وغیرہ سب شامل ہوتے ہیں۔ اور اولاد میں بیٹے بیٹیاں اور ان سے نیچے تک پوتے، پڑپوتے وغیرہ سب شامل ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو اہل فقہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے اس کے متعلق کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اختلاف "اقربون" کے مفہوم میں ہے۔ پرویز کا یہ موقف چونکہ آئمہ دین، محقق علما اور مفسرین سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا لہذا اس پر نقد کرتے ہوئے، ڈاکٹر محمد دین قاسمی صاحب لکھتے ہیں: یہاں جو کچھ موصوف نے فرمایا ہے۔ وہ اپنے ہی خیالات کی دنیا میں گھوم پھر کر فرمایا ہے۔ بارگاہ علم میں اسکی کوئی حیثیت نہیں ہے "پرویز کے بقول جس چیز کو

یہاں اہل فقہ نے متفقہ حقیقت قرار دیا ہے وہ قطعا متفقہ حقیقت نہیں ہے۔ والد اور اب نیز ولد اور ابن میں فرق ہے۔ پرویز صاحب نے جو مفہوم والدین اور اولاد کا بیان کیا ہے وہ یا تو لغت عرب سے ان کی جہالت یا پھر تجاہل عارفانہ کی بنا پر شرارت کا نتیجہ ہے۔ عربی زبان میں ماں باپ کے لئے دو لفظ "والدین اور ابوین" مستعمل ہیں۔ ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں ولادت کا براہ راست تعلق کا پایا جانا تو درکنار سرے سے ولادت ہی کے رشتہ کا پایا جانا بھی ضروری نہیں۔ صرف کسی خاص تعلق یا مدارت صحبت کا وجود ہی اس لفظ کے اطلاق کے لئے کافی ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے درج ذیل جملوں پر غور فرمایئے 1۔ زید والد بکر (زید، بکر کا باپ ہے، 2۔ زید ابو بکر (زید، بکر کا باپ ہے۔ پہلے جملے میں جس میں والد کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ امر محقق ہے کہ زید اور بکر کے درمیان ولادت کا تعلق موجود ہے، یعنی زید، بر بنائے ولادت، بکر کا باپ ہے اور بکر، بر بنائے ولادت، زید کا بیٹا ہے، لیکن دوسرے جملے کی روسے ان دونوں کے درمیان ولادت کے تعلق کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ زید بر بنائے ولادت ہی بکر کا باپ ہو۔ اور بکر اس کا بیٹا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زید ابھی تک غیر شادی شدہ ہو۔ اور بکر سرے سے کوئی صلبی تعلق زید سے رکھتا ہی نہ ہو۔ اور یہ محض زید کی کنیت ہو جو زید اور بکر کے درمیان کسی خصوصی تعلق یا دوام صحبت کو ظاہر کرتی ہو۔ جیسے ابو ھریرۃ۔ ظاہر ہے کہ یہاں جس تاریخی شخص کو ابو ھریرۃ کہا گیا ہے، اس کے اور ھریرہ (ننھی سی بلی) کے درمیان سرے سے کوئی تعلق ولادت پایا ہی نہیں جاتا۔ اس طرح امام نعمان بن ثابت کو جو ایک جید عالم دین اور امام فقہ تھے، ابو حنیفہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ حنیفہ نامی ان کی کوئی بیٹی سر سے تھی ہی نہیں۔ ہاں اگر والد حنیفۃ کہا گیا ہوتا تو پھر لغوی طور پر یہ امر ثابت ہوتا کہ حنیفہ نامی ان کی بیٹی تھی اور وہ اسکے باپ تھے۔ اس طرح جو فرق "اب یا والد یا ابوین اور والدین" کے درمیان ہے، وہی فرق "ابن اور ولد یا ابنا اور اولاد" بصیغہ جمع میں موجود ہے۔ لیکن اردو زبان میں دونوں کا ترجمہ "بیٹا" ہی کیا جاتا ہے، جس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، یا پیدا کی جاتی ہیں۔ "ولد" وہ بیٹا ہے جس کے ساتھ براہ راست ولادت کا تعلق پایا جاتا ہے۔ جبکہ "ابن" کے ساتھ براہ راست تعلق کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو سرے سے فعل ولادت ہی کا پایا جانا بھی ضروری نہیں ہے۔ صرف طویل صحبت یا کسی خاص تعلق کا وجود ہی اس لفظ کے اطلاق کے لئے کافی ہے۔ خود قرآن کریم نے مسافر کو "ابن السبیل" تو کہا ہے مگر "ولد السبیل" نہیں۔[14] "ولد ابن نیز والد اور اب" کا یہ فرق جس کی وضاحت اوپر کی گئی ہے۔ ہمیشہ سے علمائے لغت کے ہاں مسلم رہا ہے۔ علامہ ابو ہلال عسکری (جو پانچویں صدی کے نامور ادیب اور ماہر لغت تھے) نے "الفروق فی اللغۃ" کے نام سے ایک شہرہ آفاق کتاب لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے ولد اور ابن کے اس دقیق فرق کو واضح کیا ہے۔ بہر حال زیر بحث مسئلہ میں گزارش یہ ہے پوتا بہت سی صورتوں میں دادا کا ترکہ پاتا ہے۔ ان سب صورتوں میں یہی واحد صورت ہے جس میں پوتا محروم الارث رہتا ہے۔ اس کے علاوہ تقریبا تمام صورتوں میں وہ میراث پاتا ہے۔ یتیم پوتے کے میراث سے حقدار قرار پانے پر ڈاکٹر محمد دین قاسمی صاحب نے نہایت زبردست دلائل سے یہ بات ثابت کی ہے کہ مندرجہ ذیل صورتوں میں یتیم پوتا وراثت کا مکمل طور حق دار قرار پاتا ہے۔ اسلامی قانون وراثت میں بعض صورتوں میں پورے کا پورا ترکہ اور بعض میں نصف اور بعض میں کم و بیش ترکہ اسے ملتا ہے، جس کی تفصل کچھ اس طرح ہے:

میت اگر ایک یتیم پوتا اور حقیقی بہن بھائی چھوڑ کر مرے تو کل کا کل پوتے ہی کو ملے گا۔ اگر یتیم پوتے کے ساتھ میت کے ماموں اور خالہ بھی ہوں، تب بھی صرف پوتے ہی کو کل مال ملے گا۔ اسی طرح اگر ماموں زاد، خالہ زاد بہن بھائی ہوں، تب بھی پورا ترکہ پوتے ہی کو ملے گا۔ اگر میت کی پھوپھی یا اس پھوپھی کی اولاد ہو، تب بھی کل ترکے کا وارث یتیم پوتا ہی ہو گا۔ اگر صرف نانا

ہی ہو تو، اس صورت میں بھی میت کا پورا ترکہ یتیم پوتا پائے گا۔ اگر میت کا تایا، چچا یا عم زاد ہو، تب بھی یتیم پوتا ہی کل ترکے کا وارث ہو گا۔ اگر میت کے بھتیجے ہوں، تب بھی یتیم پوتا ہی سارا ترکہ پائے گا۔ اگر یتیم پوتا، اور بھانجے بھانجیاں ہی میت کے پسماندگان ہوں، تب بھی سارا ترکہ کا حقدار ہو گا۔ اگر میت کا ایک یتیم پوتا ہو اور پھر نچلی نسلوں کے کئی عزیز موجود ہوں، تب بھی صرف پوتا ہی سارے ترکہ کا حقدار ہو گا۔ اگر میت کا صرف ایک پوتا یا پوتی ہے تو کل مال کے یہی وارث ہوں گے۔ اگر میت کا ایک پوتا ہو اور باپ شریک بہن بھائی ہوں، تب بھی کل ترکہ پوتے ہی کو ملے گا۔ دوسروں کو کچھ نہیں ملے گا۔ اگر میت کا ایک یتیم پوتا ہو اور اس کے ایک یا بہت سے ماں شریک بھائی ہوں تب بھی پوری میراث پوتے ہی کو ملے گی۔ اگر میت کے پسماندگان میں صرف ایک پوتا اور میت کا نانا ہے، تب بھی پوتا ہی پورے ترکے کا واحد وارث ہو گا۔ اگر مرنے والا ایک یتیم پوتا اور بیوی چھوڑ کر مرے تو بیوی کو آٹھواں حصہ اور باقی سب کچھ یعنی (۸/۷) یتیم پوتے کو ملے گا۔ اگر میت ایک یتیم پوتا اور باپ چھوڑ کر مرے، تو باپ کو چھٹا حصہ اور باقی پانچ سدس یتیم پوتا حاصل کرے گا۔ اگر میت کا ایک یتیم پوتا اور دادا ہو تو دادا کو چھٹا اور باقی سارے پانچ سدس یتیم پوتے کو ملے گا۔ اگر میت کا ایک یتیم پوتا اور والدہ ہو تو والدہ کو چھٹا حصہ اور باقی پانچ سدس یتیم پوتے ہی کا حصہ ہوں گے۔ اگر میت کی دادای یا پڑدادی ہو، یا میت کے باپ کی نانی یا پڑنانی ہو تو اسے چھٹا حصہ دے کر بقیہ پانچ سدس میت کے یتیم پوتے ہی کو ملیں گا۔ اگر میت کی نانی یا پڑنانی ہو تو چھٹا حصہ اسے دیے جائے گا، بقیہ سارا ترکہ میت کے یتیم پوتے کو ملے گا۔ پڑنانی کی ماں اور نانی وغیرہ کی موجودگی میں بھی، ایسی ہی صورت ہو گی۔ اگر میت کا شوہر اور یتیم پوتا ہو تو شوہر کو ایک چوتھائی اور باقی سب کا سب یتیم پوتے ہی کا حصہ ہو گا۔ اگر میت کی ایک بیٹی اور ایک یتیم پوتا ہو تو نصف ترکہ بیٹی کو ملے گا اور باقی نصف یتیم پوتے کا حصہ ہو گا۔ اگر میت کی ایک سے زائد بیٹیاں ہوں اور یتیم پوتا ہو تو دو تہائی بیٹیوں کو دے کر باقی یتیم پوتے کا حصہ ہو گا۔[15] یہ مشتے نمونہ از خروارے چند مثالیں ہیں ورنہ اگر ذرا غور و فکر کیا جائے تو بہت سی ایسی مثالیں اور بھی سامنے آ جائیں گی۔ اس میں پہلی بارہ مثالوں میں یتیم پوتا پورے ترکہ کا وارث قرار پاتا ہے۔ اگلی سات (۱۳ تا ۱۹) مثالوں میں یتیم پوتے کو نصف سے بھی زائد ترکہ ملتا ہے۔ جبکہ آخری دونوں مثالوں میں اس کا نصف یا اس سے بھی کمتر قرار پاتا ہے۔ یتیم پوتے کے نصف کے استحقاق میراث کی ان تمام صورتوں کو ملاحظہ فرمایئے اور پھر پاکستان کے متجددانہ رجحانات کے حاملین کو دیکھئے جو یتیم پوتے کی محرومی میراث کی صرف ایک صورت کے مقابلے میں کم از کم ان بارہ صورتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں یتیم پوتے کو پورا ترکہ ملتا ہے۔ اسے کہتے ہیں "رائی کا پہاڑ" بنانا۔ خیر یہاں رائی تو موجود ہے ہی جس کا پہاڑ بنایا گیا ہے ورنہ یہ لوگ تو ایسے فنکار ہیں کہ بغیر رائی کے پہاڑ بنا لینا بھی ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے یتیم پوتے کے حق میں دادا کی وصیت کی صورت میں بھی جس میں یتیم پوتا محروم الارث رہتا ہے۔ اسے دادا کی وصیت کی صورت میں بھی شریک وراثت کیا جا سکتا ہے۔

یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے پر بحث کا تجزیہ

یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے پر جن لوگوں نے فقہائے ملت سے اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے اس تاثر کو عام کرنے کے لئے اسے اس انداز میں اچھالا ہے کہ "گویا شرعی قانون بس اتنا ہی ہے کہ یتیم پوتا میراث جد سے محروم قرار پاتا ہے۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ پوتا باپ کے سایہ شفقت سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ دادے کی میراث سے بھی محروم ہو جائے"۔ اس بے ہنگم شور و شغب میں قلوب واذہان پر اس تصور کی مستولی کرنے کی بھی کوشش کی گئ۔ کہ اسلامی قانون وراثت میں پوتے کے لئے دادا کی میراث پانے کی کوئی اور صورت ہے ہی نہیں۔ بس یہی واحد صورت تھی جسے علمائے امت نے گویا ختم کر دیا۔ اب

اگر اس صورت میں پوتے کو کچھ نہیں ملتا تو گویا اس کے لئے دادا سے ترکہ پانے کی ساری راہیں مسدود ہو گئیں۔ پھر ایک جذباتی پس منظر میں ہمدردی رحمت اور شفقت کے نام پر ایک ایسی فضا تیار کی گئی جس میں دادا سے محروم الارث پوتا "مجسمہ مظلومیت" دکھائی دینے لگا۔ فقہاملت (جنہوں نے از روئے اسلام اس مسئلہ کو بیان کیا) فہم قرآن سے کورے، بلید الذہن اور کودن دماغ نظر آنے لگے، جو ہمیشہ سے یتیم دشمن رہے ہیں۔ اس فضا میں تجدد پسند طبقہ نے اپنی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے ایک طرف تو آہ سرد بھر کر محکومی و تقلید وزوال کا رونا رویا۔ دوسری طرف اپنی عروج تحقیق کا مظاہرہ کرتے ہوئے "نظریہ قائمقامی" کو ایجاد کیا تاکہ یتیم پوتے سے ہمدردی اور رحمت کے تقاضے پورے ہو جائیں۔ لیکن ان کی بیوہ ماں کو نظر انداز کر دیا جو اسی نو ساخت نظریے کی اساس پر اپنے محروم شوہر کی قائم مقام بن کر اسی خسر سے ترکہ پانے کی مجاز ہے جس سے اسی بیوہ کا لڑکا یتیم پوتے کی حیثیت سے میراث پا رہا ہے۔ جسے بلا دلیل نقلی اور بلا برہان عقلی اختیار کیا جاتا ہے حالانکہ اسلام کو جیسی ہمدردی یتیموں سے ہے ویسی ہی بیواوں سے ہے اس بحث میں دیانتدارانہ تجزیہ سے ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ اسلام نے مختلف صورتوں میں یتیم پوتے کو وراثت کا حق دار ٹھہرایا ہے جس پر مذکورہ بالا دلائل میں کم و بیش اکیس مثالیں بیان کی گئی ہیں لہذا متجددانہ رجحانات کے حاملین کا یتیم پوتے کو وراثت سے کلی طور پر محروم کرنا دین سے دوری ہے اور سلف و خلف کی تصریحات کے خلاف عمل ہے، جو تحقیق کے طالب علم راقم کے نزدیک کسی طور پر درست نہ ہے۔

عورت کی ملازمت کے مسئلے پر متجددانہ رجحان اور اس کا نقد

دین اسلام ایک پاکیزہ عفت و عصمت کا محافظ دین ہے۔ جس میں خاتون خانہ کو ایک اہمیت حاصل ہے۔ اسلام خواتین کو گھر کی چار دیواری میں رہ کر اپنے خاوند کے مال و جان اور عفت و عصمت کی حفاظت کا درس دیتا ہے۔ اور گھر کے افراد کے لئے نان ونفقہ کی مکمل ذمہ داری بحیثیت حاکم مرد پر ڈالتا ہے یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے کہ وہ گھر کا کفیل ذمہ دار اور نگران ہے۔ اور قرآن مجید نے خواتین اسلام کو یہ تاکید فرمائی ہے ہے "وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ " تم اپنے گھروں میں ٹکی رہو۔ جب کہ پاکستان میں متجددانہ رجحانات کے حاملین کے نزدیک عورت کے لئے لازم اور ضروری ہے کہ اپنی گھریلو ذمہ داریاں ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مرد کے شانہ بشانہ زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ جہاد میں بھی شریک ہو۔ ملاحظہ فرمائیں: عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے اولین فرائض کو سرانجام دے اور جب ادھر سے اطمینان ہو جائے تو بے شک مردوں کے دوش بدوش، جہاد زندگی کے دوسرے شعبوں میں شریک ہو۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی گھر کو حرم اور نسل نو کی تربیت گاہ قرار دیتے ہیں۔ چناچہ وہ پرویز صاحب کے اس موقف کا رد کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: کم از کم اسلامی تہذیب کی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ حرم وہ آخری جائے پناہ ہے جہاں اسلام اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کی حفاظت کرتا ہے، عورت کو جن مصلحتوں کی بنا پر، اسلام نے شرعی حجاب میں رکھا ہے ان میں سے ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ کم از کم وہ سینہ تو نور ایمان سے منور ہے جس سے ایک مسلمان بچہ دودھ پیتا ہے، کم از کم اس گہوارے کے ارد گرد تو اسلامی فضا چھائی رہے جس میں مسلمانوں کی نسل اپنی زندگی کی ابتدائی منزلوں سے گزرتی ہے، کم از کم وہ تو کفر وضلالت اور فساد اخلاق واعمال سے محفوظ رہے جس میں ایک بچہ پرورش پاتا ہے، کم از کم وہ چار یواری تو بیرونی اثرات سے محفوظ رہے جس میں مسلمان بچے کے سادہ دل و دماغ پر، تعلیم و تربیت اور مشاہدات کے اولین نقوش ثبت ہوتے ہیں پس حرم دراصل اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ مستحکم قلعہ ہے جس کو اس لئے تعمیر کیا گیا تھا کہ یہ تہذیب اگر کبھی شکست کھا کر پسپا بھی ہو جائے تو یہاں پناہ لے سکے۔[16]

چونکہ متجددانہ رجحانات کے حاملین کا یہ موقف قرآن وسنت، آئمہ دین، محقق علما اور سلف صالحین کے منہج کے خلاف ہے عورت کو سربازار ملازمت کے لئے نکلنے کو لازم قرار دینا اور مردوں کے شانہ بشانہ کھڑے کرنا درست نہیں ہے لہذا متجددانہ رجحانات کے حاملین کے موقف کا نقد کرتے ہوئے علما محققین نے اس مسئلہ پر دلائل ذکر کئے ہیں۔ناقد محقق علما کے نزدیک پہلے اس سوال کا جواب چاہیے کہ عورتیں ملازمتوں کی شائق یا طلب گار کیوں ہیں؟ مغربی ماحول میں تو ان کا شوق ملازمت اس لئے ہے کہ وہاں خاندان اور گھر کا تصور ایک فرسودہ عمل ہے، عورتیں نہ صرف ہم مرتبہ ہونے کا دعویٰ کر کے گھریلو آزادی کی طلب گار ہیں بلکہ معاشی طور پر آزاد ہو کر ان تمام بندشوں سے بھی آزاد ہو جانا چاہتی ہے جو خاندانی زندگی میں ان پر عائد ہوتی ہیں، وہ خود کفیل ہو کر ہمہ رنگ آزاد شہری بننا چاہتی ہیں، اس میں انہیں ہزار مشکلات بھی پیش آتی ہیں لیکن وہ آزادی کامل کے لیے ہر مشکل کو برداشت کرتی ہیں۔دوسرا سوال یہ ہے ایک مسلمان عورت ملازمت کی طرف راغب کیوں ہوتی ہے؟اس کے کئی ایک اسباب ہیں جن میں بعض واقعی قابل توجہ ہیں اگرچہ عمومی رویہ محض مغرب کی نقالی سے ابھرا ہے۔مغرب کی تقلید میں ہماری انتہا پسند خواتین عورتوں کا کامل آزادی کی قائل، مردوں کی ہر قسم کی بالادستی کی مخالف اور ان کی ہر قسم کی دست نگری سے گریزاں ہیں۔یہ مغربی تعلیم اور نقالی کا نتیجہ ہے اور تسلی کا پہلو صرف یہ ہے کہ یہ فکر ابھی سرمایہ دار، بورسوار اور دانشور طبقے تک محدود ہے اور معاشرے میں ان طبقات کے خلاف ایک گونہ تعصب موجود ہے۔

عورت کی ملازمت کے مسئلے پر بحث کا تجزیہ

دین اسلام میں مرد اور عورت یقیناً انسانی زندگی کے دو پہیے ہیں جو ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں اور ان دونوں کے مجموعی عمل و کردار کا نام ہی زندگی ہے۔نہ مرد عورت سے بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ عورت مرد سے بے پرواہ۔دونوں ایک دوسرے کی ضرورت اور ایک دوسرے کے لئے لازم ہیں لیکن اسکے ساتھ وہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے۔کہ اللہ تعالی نے دونوں کو صلاحیتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف عطاء فرمائی ہیں۔جو صلاحیتیں اللہ نے عورت کے اندر رکھی ہیں، مرد ان سے محروم ہیں اور مردوں والی خصوصیات سے عورت محروم ہے، انسانی زندگی کا یہ نظام صحیح طریقے سے چلانے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں اپنے مقصد تخلیق کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں، مرد کو جو صلاحیتیں اور قوتیں دی گئی ہیں اس کے اعتبار سے اس کا دائرہ کار گھر سے باہر کا میدان ہے کاروبار و تجارت، زراعت و باغبانی، فیکٹری اور امور سیاست و جہاں بانی ہیں جبکہ عورت کا دائرہ عمل اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق گھر کی چار دیواری ہے۔وہ گھر کے اندر رہ کر امور خانہ داری سرانجام دے۔بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت اور خاوند کی خدمت کرے۔یوں عورت مرد کو خانگی معاملات اور ذمے داریوں سے فارغ رکھے تاکہ وہ یکسوئی سے گھر سے باہر کسب معاش کے لئے جدوجہد کرتا رہے۔اور مرد عورت کو معاشی بکھیڑوں سے بچا کر رکھے تاکہ وہ یکسوئی سے گھریلو کام سرانجام دے سکے۔مسلمان معاشروں میں صدیوں سے مرد اور عورت اسی انداز سے اپنے دائرہ کار میں کام کرتے آرہے ہیں۔کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ عورت بیکار ہے اور گھر میں اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔کیونکہ واقعتاً عورت گھر میں بے کار نہیں رہتی بلکہ مرد ہی کی طرح سارا دن مصروف جدوجہد میں رہتی ہے۔گھر کی چار دیواری کے اندر گھریلو امور سرانجام دینے والی عورت کو بے کار کہنا یا قرار دینا سراسر خلاف واقعہ بہت بڑا جھوٹ اور ایک عظیم بہتان ہے۔مرد کی اس محنت و سعی میں جو وہ گھر سے باہر کرتا ہے یقیناً عورت کا حصہ شامل ہے۔جو گھر کے اندر رہ کر نہایت خاموشی سے اس میں ڈالتی ہے۔اس لئے مسلمان عورت کو اس حسین جال میں پھنسنے سے گریز کرنا چاہیے۔قرآن مجید کے حکم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو[17]۔پر

عمل کرتے ہوئے اپنی سرگرمیوں کو خانگی امور تک ہی محدود رکھنا چاہیے۔ یہی ہمارے مذہب کی تعلیم ہے۔ یہی مسلمان عورت کی تاریخ ہے، اور یہی ہماری تہذیب ہے۔ اس تعلیم تاریخ اور تہذیب سے انحراف خود کشی ہے۔ تباہی و بربادی ہے اور عورت پر ظلم ہے۔ مردوں کے دوش بدوش کام کرنے والا نعرہ دنیا کی ہوس اور مادیت پرستی کو فروغ دیتا ہے۔ یہ نعرہ دراصل عورت کے اس نسوانی وقار سے محروم کرنا اور اسے مرد بنانا ہے، جو ایک عورت پر ظلم ہے۔ راقم کے نزدیک عورت اگر اپنی گھریلو ذمہ داریاں بطریق احسن ادا کرتے ہوئے، حجاب و نقاب میں شرعی حدود کا پاس رکھتے ہوئے گھر سے باہر بھی کوئی ذمہ داری ادا کر سکتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ البتہ متجددانہ رجحانات کے حاملین کا یہ کہنا کہ عورت ہر صورت مردوں کے شانہ بشانہ معاشرے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوائے۔ مردوں کی برابری اور دنیا کی جاہ و حشمت کے مقابلوں میں آئے۔ یہ موقف شریعت اسلامی کے منہج اور تعبیر اسلام کے خلاف ہے۔

خلاصۂ بحث

اس مضمون میں مختلف مابعد الطبیعاتی مسائل سے متعلق برصغیر کے اہل علم کے افکار کا مطالعہ پیش کیا گیا اور دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے متجددانہ رجحانات پر نقد کرنے والوں کا نقطۂ نظر کیا رہا ہے۔ آیا وہ متجددین پر نقد میں حقیقی اسلامی نقطۂ نظر کے قریب رہیں یا نہیں۔ اس تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ نظر موضوع سے متعلق متجددین کے نظریاتی درست نہیں اور ناقدین نے ان پر جو محاکمہ کیا ہے وہ درست ہے۔

References

[1]Al-Jumuʿah62: 10.

[2] AL-Muʾminūn 23: 51.

[3]Al-Nisā,ʾ4: 32.

[4]Al-Ḥadīs 57: 24.

[5] Ibn Ḥajar al-Asqalānī, Fath al-Bārī (Qairo: Matbat al-Salafiah, n.d), 1: 157.

[6] Dr. Muhammad Dīn Qāsmī, Tafsīr Matālib al-Furqān Kā ʿIlmī-o- Tahqīqī Jāeʾza (Lahore: Māʿrif-i-Islamī, 2021) 1: 227.

[7]النساء4:20۔ Al-Nisā,ʾ4: 20.

[8] Al-Baqarah2:3.۔

[9] Muhammad Ibn Isa Tirmadhī, Riyādh: Dār al-Salām, 1998), Ḥadīth: 2101.

[10]Al-Tawbah 9: 34.

[11]Al-Asqalānī, Fath al-Bārī, 3: 224.

[12] Muhammad Ibn Ismāʿīl al-Bukhārī (Lahore: Dār al-Salām, 2000), Ḥadīth: 1367.

[13] Al-Niāʾ 4: 11.

[14] Ḥasan Ibn ʿAbdullah ʿAskarī, al-Furūq Fī al-Lughat (Beirūt: Dār a-Āfāq, n d), 325.

[15]Qasmī, Tafsīr Matālib al-Furqān Kā ʿIlmī-o- Tahqīqī Jāeʾza, 1: 431.

[16]Ghulām Ahmad Parvaiz, Tahira Kay Nā Khatūt (Lahore: Taʿl-i-Islam Trust, n d), 145.

[17]Al-Ahāb 33: 33.